⊙ مدثر علی خان بلوچ

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

⊙⊙ ڈاکٹر لیاقت علی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

احمد جاوید کے افسانوں میں مزاحمت کا علامتی اظہار

Abstract:

A writer raises the issue of his time as well as resist against them. He accepts and writes about the effects of his time that he feels. Whenever the rights to speak have been restricted then writers explain their motives with the technique of symbolism. Author has tried to present Ahmad Javid's symbolic way of resistance. The article discusses the resistance against martial law in the stories of Ahmad Javid, so which type of symbols he uses to address his issues and to what extant he succeeds.

Keywords:

Fiction, Short Story, Symbol, Symbolic, Martial Law

احمد جاوید کا شمار جدید اُردو افسانہ نگاری میں صفِ اول کے اُن افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے جن کے بغیر اُردو افسانے کی روایت کی کڑی مربوط رکھنا ناممکن ہے۔ احمد جاوید نے ۱۹۶۶ء میں لکھنے کا آغاز کیا۔ یہ وہ عہد تھا جب علامت نگاری اُردو افسانے سے بخوبی متعارف ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ ناقدین علامت نگاری کو حقیت نگاری کی ضد سے تعبیر کر رہے تھے تو کچھ اسے نئی روایات کا ضامن قرار دے رہے تھے۔ اس وقت میں علامتی افسانہ نگاروں کو مختلف اعتراضات کا سامنا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ محض داخلی واردات پر مبنی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا کہ علامت برتنے کے لیے علامتی افسانہ نگاروں نے افسانے سے کہانی چھین لی ہے۔ تجریدیت بھی اپنے رنگ دیکھا رہی تھی۔ ان اعتراضات کی صداقت مسلم ہے مگر اس کی وجہ وہ نوسکھیے افسانہ نگار تھے جن کو افسانہ نگاری کی فن سے شناسائی نہ تھی اور دوسری بڑی وجہ مختلف رسائل اور جرائد کے ایڈیٹر تھے جنھوں نے بنا پرکھے اپنے رسائل کا پیٹ بھرنے کے لیے جو چھاپنے کو ملا چھاپ

ڈالا۔ان اعتراضات کے باوجود معتبر افسانہ نگاروں جن میں انور سجاد، رشید امجد، منشا یاد، مسعود اشعر، سمیع آہوجہ، قمر عباس ندیم، احمد داود، منور قیصر اور احمد جاوید نیاُ ردو ادب کو کئی شاندار افسانوں سے نوازا۔

احمد جاوید اپنے جاندار اسلوب، کہانی کی بنت اور دلکش علامتیں تراشنے کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ احمد جاوید کو فنِ افسانہ نگاری پر مکمل عبور ہے۔ وہ علامت برتنے کے لیے موضوع اور موضوع کو سنبھالتے ہوئے کہانی سے دامن نہیں چھڑاتے۔ اُن کے تمام افسانوں میں علامت اور کہانی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اُن کی انوکھی سوچ اور اچھوتی علامتیں اُنہیں ایک قد آور علامتی افسانہ نگار ثابت کرتی ہیں۔ اُن کے یہاں علامتوں کا ایک انوکھا تجربہ اُن کے مجموعے چــڑیــا گھــر میں نظر آتا ہے۔اس مجموعے میں استعمال کی گئی علامتیں جانوروں، حشرات اور پرندوں پر مبنی ہیں۔اس مجموعے میں شامل افسانے، بھیڑے، بھیڑ بکریاں، سانپ اور چوہے شاندار علامتی افسانے ہیں، وہ مارشل لاء کو آسیب زدہ رات کہتے ہیں اور پاکستانی جمہوری نظام کو جلتی بجھتی رات کہتے ہیں۔

انسان پتھر کے دور کا ہو، جنگل کے قبیلے کا یا اس جدید اور ترقی یافتہ دور کا اُسے ایک گروہ اور پھر گروہ سے معاشرے میں ڈھلنا ہوتا ہے۔ جب گروہ بنتا ہے تب کچھ قاعدے قانون واضح ہو جاتے ہیں اور جب معاشرہ بنتا ہے تو قاعدے قانون مرتب کر کے ایک نظام کی صورت میں انسانوں پر لاگو ہو جاتے ہیں۔انسان نے ابتدا سے اب تک کئی نظام دیکھے ہیں۔ وقت، ضرورت، مجبوری اور لالچ کے تحت نظاموں میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں اور آتی رہیں گی۔ مدرسری سے آگے بڑھ کر انسان پدرسری میں آیا، بادشاہتیں قائم ہوئیں، مذہبی نظام رائج ہوئے، اشتراقیت کے نعرے بلند ہوئے، جمہوریت کا بول بالا ہوا اور پھر امریت سے انسان دوچار ہوا۔

کانگرس کی تشکیل ہوئی، مسلم لیگ بنی، تحریک پاکستان چلی اور ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے نقشے کو میز پر رکھ کر ایک لکیر کھینچ دی گئی۔ کچھ کے لیے یہ لکیر ہندوستان تھی، کچھ کے لیے ہندوستان کی تقسیم، کچھ کے لیے پاکستان، کچھ کے لیے صرف لکیر اور کچھ کے لیے تقدیر۔ پاکستان تو بن گیا لیکن اسکے قیام کے صرف بارہ برس بعد اسے آمریت کا سامنا کرنا پڑا۔ آمریت آئی تو اپنے اثرات و ثمرات بھی ساتھ لائی۔ قانون سخت کر دیئے گئے، اخبارریں سینسر ہونے لگیں اور ادیبوں کے لفظوں اور خیالوں پر فوجی چابک لہرانے لگے۔ یہی وہ دور تھا جب احمد جاوید کے خیالات قلم کی نوک سے کاغذات پر نقش ہونے لگے۔

احمد جاوید کے یہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرتی جبر، طبقاتی تقسیم کے علاوہ انسان اور زندگی کے فلسفے کو بھی موضوع بناتے ہیں لیکن اُن کے افسانوں کا سب سے بڑا موضوع آمریت کے خلاف مزاحمت ہے۔ ایک تو اس عہد کو زباں بندی جیسی پابندیوں کا سامنا تھا دوسرا افسانہ نگار اپنی سابقہ روایت سے اُکتا کر نت نئے تجربات سے گزرتے ہوئے علامت نگاری تک آ پہنچے تھے۔اس وقت میں احمد جاوید شہر اقتدار کے پڑوسی شہر راولپنڈی میں مقیم تھے۔ راولپنڈی نہ صرف اسلام آباد کے ساتھ واقع ہونے کی وجہ سے اہم شہر ہے بلکہ اس میں جی۔ایچ۔کیو کی موجودگی اس کی اہمیت بڑھا دیتی ہے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آمریت کے قوانین، ان قوانین کی بدولت مرتب ہونے والے اثرات احمد جاوید نے براہ راست برداشت کئے۔ ان اثرات کے خلاف مزاحمت کی گونج احمد جاوید کے افسانوں میں

علامتی انداز میں صاف سنائی دیتی ہے۔

احمد جاوید اپنے افسانے 'جلتی بجھتی رات' میں پاکستان کے نظام حکومت کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہیں۔ اس افسانے کی سادہ سی علامت ہمارا رُخ پاکستان کی طرزِ حکمرانی کی جانب موڑ دیتی ہے۔ افسانے میں سورج کی روشنی ہونا جمہوریت کی علامت اور ایک بڑی چاردیواری جس کی چھت میں لکڑی کے روشن دان لگا ہے مارشل لاء کی علامت ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پاکستان میں کبھی کبھار جمہوریت کا سورج نکلتا ہے اور جلد ہی لکڑی کا روشن دان بند ہونے سے مارشل لاء کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''کہ کسی نے ہمارے گرد دیواروں کا حصار کھینچ رکھا ہے اور اوپر بہت اوپر چھت تان دی ہے۔ کہیں درمیان میں اس چھت کے اندر ایک روزن ہے جس کے کواڑ ہواؤں سے کھلتے ہیں...... جب کھلتے ہیں روشنی ہوتی ہے۔ جب نہیں کھلتے اندھیرا رہتا ہے...... وہی روزن بس وہی روزن تو روشنی کا ذریعہ ہے باہر کا راستہ ہے...... جو ہماری پہنچ سے باہر ہے۔'' (۱)

احمد جاوید کے مطابق مارشل لاء ہو یا جمہوریت پاکستان کو ہمیشہ ایک ہی طرز کے رہبر میسر آئے ہیں بس راہبروں کی شکلیں، لب و لہجے اور اندازِ واردات بدلتے رہے لیکن اعمال میں سبھی یکساں ہیں۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''روشنی جب جب جلتی جب جب بجھتی میرے آگے چلنے والے بھی بدلتے کسی اور شکل میں ڈھلتے ......سو میں ہر بار ایک نئی سمت رواں تھا کہ میری تو پہلے ہی کوئی سمت نہ تھی مگر میرے آگے چلنے والوں کا بھی کوئی آگا تھا نہ پیچھا...... یوں لگتا...... جیسے کوئی ایک ہی شخص ہر بار صورت بدل کر آتا ہے اور ایک نئی سمت کو لے جاتا ہے...... اور ہر بار ایک نئی داستان سُناتا ہے...... سب کو شناسائی کا دعویٰ...... مگر سب اجنبی...... کسی کا کوئی گھر نہیں کوئی دروازہ نہیں...... منزل نہیں راستہ نہیں...... سو سب اجنبی تھے......'' (۲)

احمد جاوید پاکستان میں لگنے والے مارشل لاء کو ایک آسیب زدہ رات کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ یہ افسانہ 'آسیب زدہ رات' اُن کے مجموعے غیر علامتی کہانی میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ اس پہلو کو اُجاگر کرتا ہے کہ دیگر شعبۂ زیست کے علاوہ لکھاریوں کے لیے یہ عہد کس قدر کٹھن اور دشوار تھا۔ 'آسیب زدہ رات' میں مختلف جانے انجانے خوف ہوتے ہیں۔ جن میں انسان اپنے محافظوں سے بھی ڈرتا ہے۔ ہر لمحے اُسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اُس کی شکایت نہ ہو جائے۔ اُس کے پاس کوئی ایسی تحریر نہ مل جائے جو مارشل لاء یا مارشل لاء لگانے والی قوتوں کو گراں گزرے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''مگر میں نے کیا کیا ہے؟...... سوچتا رہا...... کوئی ایسا دوست جس سے میرا ملنا جلنا ہو...... کوئی ایسا شخص جو شریف نہ ہو امن پسند نہ ہو...... مگر کوئی ایسا نہ تھا...... میرے پاس کچھ کتابیں تھیں، کچھ عام سی کہانیاں، کچھ ناول جو بک سٹالوں پر کھلے عام بکتے ہیں، مگر کمزور دل ہوں، گذشتہ برس جلا دیئے تھے...... کچھ کاغذ تھے بس یونہی بیکار سی باتیں ادھر اُدھر لکھی تھی وہ پھاڑ دیئے تھے...... اب

کچھ نہیں تھا پھر کیسی شکایت؟"(۳)

اس افسانے میں پرانا گھر پاکستان کی علامت ہے۔جس کی دیواریں بوسیدہ ہیں، پلستر اُکھڑ رہا ہے اور چھت اسقدر جھک چکی ہے کہ کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔آسیب زدہ رات مارشل لاء کی علامت ہے جس میں انسان کے حواس اُس کے بس میں نہیں رہتے ، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور ہلکی سی آہٹ سارے وجود کا خون سا کن کر دیتی ہے۔ایسی آسیب زدہ رات اگر بار بار آئے اور دس دس سالوں پر محیط ہو تو زندگی بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔چاہنے کے باوجود اس عہد میں نہ ہی کچھ لکھا جا سکتا اور نہ ہی اسے کاٹا جا سکتا ہے۔کیوں کہ کسی چھوٹی سی شکایت پر انسان دھر لیا جاتا ہے۔احمد جاوید اس گھٹن زدہ عہد کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خون جو تھوڑی دیر پہلے خوف سے منجمد ہو گیا تھا۔اس کے اچانک بول پڑنے سے آبشار کی طرح مردہ رگوں میں گرنے لگا......ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ گونجنے لگی......دل جو بند ہو چکا تھا دھڑک اُٹھا جیسے زخمی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا دیواروں سے ٹکراتا ہے......میں نے اُٹھنا چاہا مگر خون ابھی ٹانگوں تک نہ پہنچا تھا......بولنا چاہا مگر زبان لڑکھڑا گئی......اب میں اسے کیسے بتاتا......لکھتا ہوں اور کاٹتا ہوں......کاٹتا ہوں اور لکھتا ہوں۔مگر یہ آسیب زدہ رات کچھ ایسی طویل ہے نہ لکھی جاتی ہے نہ کاٹی جاتی ہے۔"(۴)

پاکستان کو یہ المیہ درپیش رہا ہے کہ جو بھی حکمرانی کرنے آیا اُس نے ملک کو سنوارنے کے دھواں دار دعوے کئے اور جب گیا تو لوٹ کر سب کچھ لے گیا۔وطنِ عزیز کو سنوارا اس لیے جاتا ہے کہ اُسے لوٹا جا سکے۔یہی کھیل تماشہ ہمارے ملک میں اس کے جنم سے چلا آ رہا ہے۔کبھی افواج پاکستان مارشل لاء کے تسلط سے اور کبھی سیاستدان جمہوریت کی آڑ میں اسے سجانے سنوارنے میں دن رات ایک کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب وہ جاتے ہیں تو وطنِ عزیز کا سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔یہ اتنے چالاک ثابت ہوتے ہیں کہ سادہ لوح عوام پھر سے اپنا سب کچھ لٹا کر ان کے شعبدوں میں آ جاتے ہیں اور پھر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔یہی صورتحال احمد جاوید کے افسانے کھیل تماشہ میں نظر آتی ہے۔احمد جاوید لکھتے ہیں:

"پل کے پل میں منظر اور ہوا...... جب ہر چیز ویران ہوئی تب وہ باہر گلی میں آئے......تن کر کمر سیدھی کی......ان کے ہنگام سے گلیوں میں پھر ہجوم ہو گیا تھا......عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے لگی تھیں......آنکھیں ملتے بچے جاگ اٹھے تھے اور اب دائرہ در دائرہ حصار بنائے کھڑے تھے......مگر ان کے چہروں پر نقاب تھے کسی نے شناخت نہیں کیا ہر کوئی حیرت میں مبتلا تھا اور سوچتا تھا خدا خیر یہ کون ہیں اور کیوں کسی پرائے کا گھر اجاڑتے ہیں......قریب تھا کہ کوئی ان کو روک کر پوچھ لیتا......مگر انہوں نے خود ہی اپنے نقاب چہروں سے الگ کر دیئے اور لوگوں کی حیرت کو بھی حیران کیا......لوگوں نے آنکھیں مل مل کر انہیں دیکھا......ایسا تماشہ انہوں نے پہلے کب دیکھا تھا......پھر نعرہ تحسین بلند ہوا......لوگوں نے پھر تالیاں پیٹیں اور سیٹیاں بجائیں......

انہوں نے جھک کر آداب کیا......کھیل تمام ہوا......''(۵)

احمد جاوید نے اس افسانے میں بہت سادہ علامتیں استعمال کی ہیں۔اس افسانے کی پہلی علامت کھیل تماشہ ہے یہ پاکستان کی حکومتی نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔خوبصورت گھر کی تعمیر جس کی سجاوٹ میں انتھک محنت کی جاتی ہے وہ پاکستان ہے۔شعبدہ گر پاکستان کا حکمران طبقہ ہیں۔ جو مختلف شعبدوں سے عوام کو کھیل تماشے دیکھاتے اور بے وقوف بناتے رہتے ہیں۔ یہ شعبدہ گر پورا ملک لوٹ لینے کے باوجود عوام کو پھر بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ مختلف ہتھکنڈے اپناتے ہیں اور عوام چاہتے نہ چاہتے ان کے ہتھکنڈوں کا شکار ہوتی ہے اور ان کی کامیاب دھوکہ بازی پر تالیاں اور سیٹیاں بجانے لگتی ہے۔

احمد جاوید کا افسانہ ’غیر علامتی کہانی‘ خالصتاً علامتی کہانی ہے۔اس افسانے میں احمد جاوید مارشل لاء کے باعث پیدا ہونے والے معاشرتی جمود، معاشرتی رویوں اور گھٹن کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ وہ معاشرے میں بسنے والے لوگوں کی بے حسی کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اور میں ان سب کی طرف دیکھتا ہوا، مگر کوئی منظر ایسا جو ذرا الگ ہو، مختلف ہو......کہ یہ برسوں سے جامد و ساکن دنیا میرے لیے تحریک کا باعث نہیں۔کہو میں ان کے بارے میں کیا لکھوں جو اپنے لکھے سے باہر نکلنے کو آمادہ نہیں......کوئی نئی بات......کوئی نیا قصہ......''(۶)

مذکورہ افسانے میں احمد جاوید معاشرے کے جمود کے خلاف علامتی انداز میں مزاحمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کم سن لڑکے اپنے میلے کچیلے کپڑوں اور سیاہی سے لتھڑے ہوئے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کو آگے پیچھے کھینچتے گرتے پڑتے ایک پرانی ویران کھنڈر حویلی میں گھس کر چھپ جاتے ہیں شاید کوئی دوسرا لڑکا انہیں تلاش کرتا ہوا آئے گا اور شاید پالے گا......میں ذرا توجہ کرتا ہوں...... یہ بچوں کا کھیل......اور بڑے تاسف سے خیال کرتا ہوں انہیں بڑا ہوتے، بھوک اور ننگ کے ہاتھوں ٹھوکریں کھاتے، رشوتیں لیتے، رشوتیں دیتے...... ڈاکہ ڈالتے کاروبار میں لوٹتے کھسوٹتے......حویلیاں کھڑی کرتے اور نظر انداز کرتا ہوں کہ یہ برسوں سے ایک ہی طرح عمل کرتی دُنیا مجھے کوئی تحریک نہیں دے سکتی......''(۷)

’غیر علامتی کہانی‘ میں جنگ مارشل لاء کی علامت ہے۔جیسے جنگ کے قاعدے قانون الگ ہوتے ہیں ویسے ہی مارشل لاء میں قاعدے قانون بدل دیئے جاتے ہیں۔ جیسے جنگ اپنے اثرات لوگوں کے اعصاب پر مرتب کرتی ہے ویسے ہی مارشل لاء کی پابندیاں بھی انسانوں کے اعصاب شل کرتی ہیں۔اسی حقیقت کو احمد جاوید یوں قلمبند کرتے ہیں:

''میں اب راستہ تلاش کرتا ہوں جو واقعی کھو گیا ہے۔ایک راہ گیر سے کہتا ہوں اس محلے میں نوارد ہوں، بازار سے ادھر آ گیا تھا......کیا تم راستہ بتا سکتے ہو......؟ وہ مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کرتا ہے، ہم کچھ دور جاتے ہیں۔ پھر اس سے ہمت کر کے پوچھتا ہوں......کیا لڑائی چھڑ گئی......؟ وہ بھی پہلے کی طرح حیرت سے مجھے دیکھتا ہے اور پھر ذرا فکر مندی سے کہتا ہے......دعا کرو اب رک

جائے۔تو کیا یہ دیر سے...... وہ رنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہتا ہے بہت سے لوگوں کے اعصاب پر
اس طویل جنگ نے اثر ڈالا ہے...... اعصاب قابو میں رکھو۔"(۸)

عام طور پر دمدار ستارے کو بدبختی کی علامت مانا جاتا ہے۔ جب یہ کسی خطے پر نظر آتا ہے تو وہاں کے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ خطے پر کسی جگہ قہر نازل ہونے والا ہے۔ اس قہر کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں جیسے بدامنی، آسمانی آفات یا کوئی قحط۔ اس افسانے میں احمد جاوید نے مارشل لاء کی وجہ سے پابندِ سلاسل ادباء اور عام شہریوں کے لیے مزاحمتی انداز میں دمدار ستارے کی علامت استعمال کی ہے۔ یہ ایک ایسی جیل میں بند ہیں جہاں اُن کے پاس بنیادی حقوق بھی میسر نہیں ہیں۔ یہ لوگ خود کو بے حس بنا کر زندہ رکھنے پر مجبور ہیں۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

"سب نارمل رہنا چاہیے...... دماغ پہ دباؤ ہو، تو بلڈ پریشر دل کی بیماریوں کا باعث بنتا ہے......
حرکت قلب بند ہو جاتی ہے...... دماغ کی شریان پھٹ جاتی ہے...... ہم کسی بات کا اثر قبول نہیں
کرتے...... کوئی بات دل کو نہیں لگاتے...... کبھی نہیں کڑھتے...... ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں......
گیت گاتے ہیں...... خیر اب تو دیر سے سب نارمل ہے...... جو کچھ ہوتا ہے بس عادتاً ہوتا ہے......
لوگ چیختے ہیں تو لگتا ہے انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی بس عادتاً...... ہماری بے چینی بھی بس
عادتاً"(۹)

وہ ادباء جو اپنی لکھت کی بدولت پابندِ سلاسل ہیں اُن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے احمد جاوید لکھتے ہیں:

"جو ہنستا نہیں وہ روتا ہے...... ہنستے ہنستے رونا چاہیے اور روتے روتے ہنسنا چاہیے، ہنسنے سے
طبیعت بشاش ہوتی ہے...... رونے سے جی ہلکا ہوتا ہے...... زیادہ یہ کہ ہنستے ہوئے اور روتے
ہوئے آدمی مصروف رہتا ہے۔ چپ چاپ ہو تو سوچتا ہے...... سوچنا بری بات ہے...... سوچنے
والے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔"(۱۰)

ایسا معاشرہ جو مارشل لاء کے تابع ہو کسی جیل سے کم نہیں ہوتا کیوں کہ افسانے میں دیکھائی گئی جیل کی بیرونی باڑ نظروں سے اوجھل ہے۔ اس مارشل لاء کے عہد میں پورا ملک ایک جیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یوں جیل علامتی طور پر پاکستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس جیل میں قیدی کس طرح زندگی گزار رہے ہیں یہ دراصل ہمارے معاشرے کا عکس ہے جس کو احمد جاوید نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

"ہم میں سے اکثر نے بوسیدہ چھتیں ہٹا دی ہیں کہ ان کے گرنے کا اندیشہ ہے ہمارے چائے کے
مگوں میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ برتنوں کو زنگ لگ گیا ہے۔ کپڑوں کو بخیہ گری کی حاجت نہیں رہی
چیتھڑے لٹکتے ہیں۔ داڑھیاں بڑھ گئیں ہیں۔ بینائی کمزور ہو گئی ہے...... سماعت پر اعتبار نہیں
رہا۔ سر کے بال کھچڑی ہیں مگر گلے کی کوئی بات نہیں......"(۱۱)

افسانہ 'گمشدہ شہر کے شعبدہ گر' احمد جاوید کے مجموعے **گمشدہ شہر** میں شامل ہے۔ یہ احمد جاوید کا ایسا افسانہ ہے جس میں وہ مارشل لاء کے حاکموں کے لیے بادشاہ کی علامت استعمال کرتے ہیں۔ مارشل لاء کے حاکم بادشاہ کی طرح

اتنے بااختیار ہیں کہ جو چاہے کر سکتے ہیں احمد جاوید لکھتے ہیں:

''بادشاہ کی نازک مزاجی پر یہ بدخوابی گراں تھی۔ پہلے حکم ہوا کہ شہر کو آگ لگا دی جائے کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری......مگر مشکل یہ تھی کہ شہر نہ ہوا تو حکومت کہاں ہوگی۔ پھر حکم ہوا کہ سب کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی جائیں مگر دشواری یہ تھی کہ خواب آنکھوں سے نہیں دیکھے جاتے ......ایک تجویز یہ تھی کہ سونے پر پابندی عائد کر دی جائے اور نہیں تو خواب دیکھنا ممنوع قرار دیا جائے......مگر سب ناممکن تھا۔ ناقابل عمل تھا۔''(۱۲)

ہمارے ہاں حاکم وقت اپنی مرضی سے قانون توڑتا اور بناتا ہے۔ اُسے وہی قوانین پسند ہوتے ہیں جو اُس کی طبیعت پر گراں نہ ہو۔ حکمران طبقے کے خلاف بھرپور مزاحمت نظر آتی ہے۔ عام آدمی کے حصے میں حکم کی تعمیل ہے۔ وہ یہ تعمیل صدیوں کرتا رہا ہے لیکن مارشل لاء نے عام عادمی سے خواب دیکھنے کا حق چھین لیا ہے۔ خواب دیکھنے سے نہیں روکا جا سکتا لیکن سُنانے سے روکا جا سکتا ہے۔ یہ وہی زباں بندی ہے جو اس عہد کے ادیبوں نے برداشت کی اور علامتیں تراش تراش کر اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔

'گشت پر نکلا ہوا سپاہی' میں گرمی کا شدت مارشل لاء کی پابندیوں اور پُرتشدد عہد کی جانب ایک واضح اشارہ ہے۔ یہ افسانہ اس دور کی صحافت کے خلاف بھی مزاحمت کرتا ہے جو فضول اور بے معنی خبروں سے اخبار بھر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُن لوگوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتا ہے جو ان اخباروں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''شہر کی ساری گلیوں کی طرح ادھر بھی ہاکر آتا ہے اور آواز لگا کر اخبار بیچتا ہے......رات بھر بے خبری کی نیند سونے والے ہر صبح اس امید پر جاگتے ہیں کہ ان کے جاگنے تک اِدھر اُدھر کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوگا......کچھ نہ کچھ ہوتا بھی رہتا ہے مگر صبح جب وہ اخبار ہاتھوں میں تھامتے ہیں تو اس میں کچھ نہیں ہوتا......یا شاید ہوتا ہے......تصویریں ہوتی ہیں کہ کسی کے کان غائب ہیں کسی کی آنکھیں کسی کی ناک......عجب مسخرے لگتے ہیں......لوگ دیکھتے ہیں مگر ہنستے نہیں......بلکہ حیران ہوتے ہیں ان لفظوں پر کہ جن کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی......یہ زبان کس ملک میں بولی جاتی ہے......شاید کہیں بھی نہیں......وہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ کہ جنہیں بہت بھوک لگتی ہے اور پیاس بھی......وہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے......بلکہ انہیں چاٹتے ہیں......سطر سطر......لفظ لفظ...... اور انہیں چاٹتی ہیں مکھیاں......نہ چاٹیں تو کیا کریں بھوکے مریں۔''(۱۳)

احمد جاوید لکھتے ہیں:

''کوئی بوڑھا شخص غلاظت کے ڈھیر پہ جھکا ہے......شاید وہ اکتا کر ادھر نکل آیا ہے وہ وہاں سے ایک اخبار کھینچتا ہے......جیب سے رومال نکال عینک کے شیشے صاف کرتا ہے......پھر وہی رومال ناک پہ رکھتا ہے......اور زبان نکال اخبار کو کہیں کہیں سے چاٹنے لگتا ہے بقیہ حصہ پر مکھیاں چمٹی ہیں......پھر ایک اور آتا ہے......پھر ایک اور......پھر ایک اور......!''(۱۴)

اس افسانے میں گشت پر نکلا ہوا سپاہی امریت کی علامت ہے جو تندرست ہے۔ مکھیوں کی طرح اخبار چاٹنے والا آدمی عوام کی علامت ہے۔ ایسی سست عوام کی علامت جو بغیر کچھ کیے ہر روز نیا اخبار چاٹتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ بدل گیا ہوگا۔ احمد جاوید اس افسانے میں کچھ انسانوں کو کتے بھی کہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو معاشرے کے لیے ناسور ہیں۔ پوسٹر لگانے والا نوجوان جمہوریت آنے کے اور مارشل لاء کے جانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ احمد جاوید کا افسانہ 'سن تو سہی' موروثی نظامِ حکومت کے خلاف مزاحمت کا علامتی اظہار ہے۔ یہ موروثی نظامِ حکومت صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس نے آمریت اور جمہوریت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ حکومتی طبقہ عام طبقے کو ایسا یقین دلاتا ہے کہ اگر اُنھیں کچھ ہو گیا تو عوام کا پرسان حال کون ہوگا۔ عوام اس خدشے کے باعث اپنی جان سے بڑھ کر ان کی حفاظت کرتی ہے۔ احمد جاوید اس منافقت کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''میں تمھارے قبیلے کا آخری سردار ہوں اور تم قبیلے کے آخری افراد ہو۔ نہ میرے بعد آگے کچھ ہے اور نہ تمھارے بعد آگے کچھ ہے۔ جب میں نہ رہوں گا، تم بھی نہ رہو گے۔ تب یہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ دریا اپنا راستہ بدل دے گا اور تمھاری بستی بھک سے اُڑ جائے گی۔ سو کچھ توقف کے بعد اُس نے پھر کہا، اب تمھاری زندگیاں میرے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں...... ''(۱۵)

جب بھی کوئی سردار مرتا ہے تو اُس کی جگہ اُسی کا بیٹا یا بھائی لے لیتا ہے۔ جب کوئی سیاستدان مرتا ہے اُس کی جگہ اُس کا بیٹا لے لیتا ہے۔ جب کوئی سردار مرتا ہے تو یہ سوچے سمجھے بنا کہ اُس کا بیٹا اس اہل ہے یا نہیں پگڑی اُس کے سر پر رکھ دی جاتی ہے۔ پھر وہ ہی قبیلے یا ملک کی عوام کی قسمت کے فیصلے کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ احمد جاوید نے لکھا ہے:

> ''اگلے دن صبح بھی ہوئی اور سورج بھی نکلا ہر چند کہ سردار مر چکا تھا۔ لوگ اس کے جنازے کے گرد کھڑے اپنے ہونے پر گماں کر رہے تھے کہ کسی صدا نے اُنہیں چونکا یا وہ کہہ رہا تھا۔ اب آگے اس کا تمہیں اختیار ہے مگر اتنا یاد رہے کہ میرے باپ نے تمہاری زندگیاں میری زندگی کے ساتھ وابستہ کر دی ہیں تا کہ تم...... تا کہ تم زندہ رہ سکو۔ لوگوں نے یہ سنا اور ششدر ہوئے۔ اور پھر اتنا ششدر ہوئے کہ دیوانوں کی طرح گریباں چاک کر لیے اور چلاتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگ پڑے۔''(۱۶)

احمد جاوید کے افسانے 'آثار' میں مارشل لاء سے ماحول میں پیدا ہونے والی گھٹن صاف صاف دیکھائی دیتی ہے وہ خود لکھتے ہیں:

> ''۱۹۷۷ءمیں جب ایک بار پھر مارشل لاء نافذ ہوا تو شعروادب کو ایک ایسا زرخیز موضوع ہاتھ آ گیا جو علامتوں سے بھرا تھا۔ اس زمانے میں ۱۹۸۳ء تک میں نے جو کہانیاں لکھیں ان میں سے بیشتر میرے پہلے مجموعے 'غیر علامتی کہانی' میں شامل ہیں۔ جن احباب نے اس مجموعے کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ بعض کہانیوں میں 'حبس' اور موسم کے متعلق جا بجا ذکر ہے۔''(۱۷)

وہ اعتراف کرتے ہیں کہ مارشل لاء کے دور کے لیے انہوں نے 'حبس' کو علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ اُن کے

اس اعتراف کی مثالیں اُن کے مختلف افسانوں میں جا بجا ملتی ہیں۔ ان ہی افسانوں میں احمد جاوید کا افسانہ ' آثار' ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ داخلی واردات پر مبنی ہے جس کا خلاصہ کرنا کافی مشکل ہے لیکن اس میں جس انداز میں گھٹن بھری فضا کی تصویر کشی کی گئی ہے، اُس سے صرف نظر زیادتی ہوگی۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''حبس کے گھر تھے اور حبس کی دیواریں...... گلیاں بازار اور ہتھیار سب کی فطرت میں گھٹن تھی حبس تھا...... زمین حبس اُگلتی تھی آسمان حبس برساتا تھا۔ ہم نے ہاتھ بلند کیے کہ جس مشکل پہ اختیار نہ ہو اس کا دعا کے سوا چارہ کیا ہے...... مگر آسمان کو تو دیمک چاٹتی تھی۔ وہ بوسیدہ اور شکستہ رفتہ رفتہ برادے میں ڈھلتا تھا اور ہمارے اٹھے ہوئے ہاتھ اور پھیلے ہوئے دامن اس سے بھر رہے تھے۔ انتظار کی پیاس ہونٹوں پر پپڑیاں بن گئی تھی۔ گھٹن رگوں میں ہونکتی تو جنگل گونجتا...... دن اور رات کی تمیز کہاں کہ سب کو چلچلاتی دھوپ کھا گئی تھی۔ ایسا عالم ہو تو کیا قیام کا کوئی مقام ہے؟'' (۱۸)

احمد جاوید کے افسانے ' آثار' میں مرکزی کردار کو اخبار میں سیاسی خبروں کی بجائے موسم کی خبروں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ حبس کا موسم ہے۔ پھر بارش کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ بارش اتنی ہوتی ہے کہ سب مٹی کی دیواریں ڈھہ جاتی ہیں اور پلستر بھی اکھڑ کر ملیا میٹ ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک اخبار والے کی سائیکل تیزی سے آتی ہے اور مرکزی کردار کے پاس رکتی ہے۔ اخبار والا اخبار اُچھالتا ہے اور کہتا ہے کہ اُمید رکھنی چاہیے کہ موسم بدلے گا کہ کچھ آثار بھی ہیں۔ لفظ آثار ایک ایسی علامت ہے جس کے بارے میں یونگ نے کہا تھا کہ علامت محض ماضی کی بات اُجاگر کرنے کا نام نہیں بلکہ علامت مستقبل کی جانب بھی اشارے کرتی ہے۔ لفظ آثار پر ڈاکٹر وزیر آغا کی قمقمے والی مثال بالکل صادق آتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے قمقمے کی مثال کچھ یوں دی ہے:

''اگر رات اندھیری ہے اور میدان میں فقط ایک قمقمہ روشن ہے اور آپ اس قمقمے کی طرف آ رہے ہیں تو جسم سے جڑا آپ کا سایہ آپ کے تعاقب میں آئے گا اور قدم بہ قدم مختصر ہوتا چلا جائے گا۔ حتٰی کہ جب آپ قمقمے کے نیچے آ کھڑے ہوں گے تو سایہ آپ کے قدموں میں سمٹ کر غائب ہو جائے گا۔ مگر جب آپ قمقمے سے آگے بڑھیں گے تو یہی سایہ آپ کے قدموں سے نکل کر آپ کے آگے آگے چلنے لگے گا اور بتدریج بڑا ہوتا چلا جائے گا تا آنکہ اندھیروں میں جذب ہو کر معدوم ہو جائے گا۔'' (۱۹)

عالیشان عمارت کے ملبے کو دیکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں یہ کسی عالی شان عمارت کے آثار ہیں۔ اسی طرح کسی جگہ پر کسی عمارت کی بنیاد رکھی جا چکی ہو تو اُسے دیکھ کر ہم کہیں گے کہ یہ آثار بتاتے ہیں کہ عمارت عالیشان بنے گی۔ یا پھر مستقبل میں لفظ آثار کچھ ایسے بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر گرمی کے موسم میں ٹھنڈی ہوا چلنے لگے بادل چڑھ آئیں تو ہم کہتے ہیں کہ بارش کے آثار ہیں۔

احمد جاوید نے اس افسانے میں آثار کو اُمید کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اُمید ایک ایسی چیز ہے جو گھٹن زدہ ماحول میں ہر انسان کے جینے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس افسانے میں احمد جاوید نے حبس کو مارشل لاء کے

عہد سے تعبیر کیا ہے جس میں عام انسانوں پر بھی اسقدر پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں کہ حبس کے موسم کی طرح سانس لینا محال ہو جاتا ہے۔ اچھے دن آنے کی اُمید اُنہیں بُرے اور مشکل دن گزارنے میں مدد دیتی ہے۔

احمد جاوید کے مطابق یہ لوگ بندش کے باعث گھٹن کا شکار ہیں، پسینے میں لت پت ہیں، یہاں تک کہ پسینہ ان کی کلایوں سے ہوتا ہوا کہنیوں سے ٹپک کر نیچے گر رہا ہے مگر وہ سر جھکائے اپنے کام میں غرق رہتے ہیں اور اپنے حالات بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرے سامنے ایک زیرِ تعمیر عمارت کے مزدوروں نے قمیصیں اُتار دی ہیں کہ گرمی بہت ہے...... سبزی ڈھونے والوں کے سانولے چہرے کچھ اور سنولا گئے ہیں، ماتھے کا پسینہ آنکھوں میں اور کلایوں کا کہنیوں سے ہوتا زمین پر گرتا ہے۔ بابوؤں کی قمیصیں پشت پر درمیان سے بھیگ رہی ہیں اور اردگرد سوکھے ہوئے پسینے کی پلاٹیں ہیں، جو ننگے سر ہیں وہ تو عذاب میں ہیں جنہیں چھتریاں میسر ہیں وہ بھی کلائیوں سے پسینہ پونچھتے ہیں۔'' (۲۰)

احمد جاوید نے اپنے افسانے 'بھیڑ بکریاں' میں تین علامتیں استعمال کی ہیں۔ کتا، بھیڑ بکریاں اور چرواہا۔ چرواہا مارشل لاء لگانے والے حاکموں کی علامت ہے، بھیڑ بکریاں عام عوام اور کتا حکمران کا کارندہ ہے۔ یہ ایک وسعت بھرا مزاحمتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں احمد جاوید پورے سیاسی نظام کو، پوری عوام کو اور حکمران طبقے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ عام آدمی صدیوں سے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جا تا رہا ہے۔ یہ بھیڑ بکریاں اپنے حکمران کے حکم پر ڈنڈے کے ڈر سے یا بھوک کے خوف سے چرواہے یعنی حکمران کی مرضی سے چلتی پھرتی ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ چرواہے کی علامت اُس حکمران کی ہے جو مارشل لاء کے دوران حاکم بنتا ہے۔ جیسے چرواہا بکریوں کا اصل مالک نہیں ہوتا ایسے ہی مارشل لاء لگانے والا بھی ملک کا رکھوالا ہوتا ہے نہ کہ مالک۔ کتے کی علامت اُن آفسر شاہوں کے لیے استعمال ہوئی ہے جو اس حکمران کے نمائندے یا کارندے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مارشل لاء نافذ ہونے سے اسمبلی تحلیل ہو جاتی ہے اور تمام وزراء دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اُن کی جگہ مارشل لاء لگانے والا حاکم اپنی مرضی کے کارندے لاتا ہے۔ وہ بھی چرواہے کی طرح سوچتا ہے کہ حکومت کرنا بہت آسان ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:

''اُس نے جانا بھیڑ بکریاں چرانے میں کچھ مشکل نہیں تھی اک ذرا سا کام تھا۔ اب وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ جس قدر زیادہ کتے ملکیت میں ہوں اسی قدر زیادہ بھیڑ بکریاں چرائی جا سکتی ہیں۔ بلکہ دُنیا بھر کی بھیڑ بکریوں پر حکمرانی ممکن ہے...... ایسی حکمرانی کہ جس کا عرصہ پوری فراغت سے اونگھ کر بسر کیا جا سکتا ہے۔'' (۲۱)

حکمرانوں کے افسر شاہی وفاداروں کے لیے کتوں کی علامت استعمال کی گئی ہے لیکن حکمران یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کی مہارت حفاظت کی ہے نہ کہ حکومت کی۔ جب انہیں حفاظتی انتظامات کی بجائے حکومتی امور سونپے جاتے ہیں تو وہ بھی افسانے میں بتائے گئے کتے کی طرح بھیڑ بکریوں کے پیروں تلے آ کر روندے جاتے ہیں۔ اس افسانے کی تیسری علامت بھیڑ بکریاں یعنی عوام ہے۔ جن کے پاس اپنا کوئی شعوری نصب العین نہیں ہے۔ آج بھی اُنہیں ہانکنے کے لیے کوئی

نہ کوئی چاہیے۔

گمشدہ شہر کی داستاں سقوط ڈھاکہ پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ احمد جاوید نے اپنے افسانوی مجموعے چڑیا گھر کے ابتدائیے میں کچھ یوں لکھا ہے:

''گمشدہ شہر کی داستان پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد اور شاید اس کے اثر میں لکھی گئی ہے۔''(۲۲)

سقوطِ ڈھاکہ تاریخ پاکستان کا ایسا دکھ بھرا باب ہے جس میں اپنے ہی اپنوں کو کاٹنے مارنے میں لگے رہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب میں اُردو اور بنگالی زبان، ون یونٹ، سیاسی عدم استحکام اور ایوب خان کی آمریت شامل کیے جاتے ہیں۔ لیکن حقائق کو جانچا جائے تو نتائج کچھ اور سامنے آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسائل ہوں گے لیکن جب ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا تو بھٹو صاحب نے جانے سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب کا انکار اس درد بھرے باب کی پہلی سطر ثابت ہوا۔ انڈیا کشمیر اور ۱۹۶۵ء کی جنگ ہارنے کے بعد مغربی ممالک میں پاکستان کے خلاف غلط پراپیگنڈا کر چکا تھا۔ اس وقت میں مشرقی پاکستان میں پاکستان کے فوجی دستے موجود تھے اور بعد میں بیس ہزار فوجی اور بھیجے گئے۔ تمام تر فوجی امور جنرل نیازی کے سپرد کیے گئے۔ جنرل نیازی نے بڑے احسن انداز سے اپریل ۱۹۷۱ء تک معاملات پر قابو پا لیا تھا۔ اس وقت تک مجیب الرحمان مشرقی پاکستان میں قومیت کا بیج بو کر پروان چڑھا چکے تھے۔ اس صورتحال میں مکتی باہنی تنظیم نے خاص طور پر غیر بنگالی یا مغربی پاکستان کے باسیوں پر دہشت گردی کی تاریخ رقم کی۔ اس کا فائدہ بھارت نے اُٹھایا اور اپنی فوج مکتی باہنی میں شامل کر کے باقاعدہ کارروائیوں کا آغاز کیا۔ الزام یہ تراشا گیا کہ پاکستانی فوج بنگالیوں پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ مکتی باہنی کے علاوہ البدر تنظیم جو جماعت اسلامی کی تنظیم تھی اُس نے دانشوروں کو گھر سے اغوا کیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ اس واقعے کا انکشاف بھارت کے قوم پرست رہنما نیتا جی بوس کی بھتیجی اور نامور مصنفہ سرمیلا بوس نے اپنی کتاب میں ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے متعلق میں کیا۔(۲۳) الغرض پاکستانی سیاسی ناچاکیاں اور کمزور سفارتکاری ہی سقوطِ ڈھاکہ کا اصل سبب بنی۔

اس افسانے میں احمد جاوید نے گمشدہ شہر کی علامت مشرقی پاکستان کے لیے استعمال کی ہے۔ اس شہر کی طرح مشرقی پاکستان بھی رفتہ رفتہ ہمارے ہاتھوں سے پھسلتا گیا۔ احمد جاوید کے نزدیک کوئی ایک نہیں کئی موقعے ملے لیکن حکومت اور عوام دونوں ان موقعوں پر مشرقی پاکستان کی حفاظت نہیں کر پائے۔ احمد جاوید سقوطِ ڈھاکہ میں مکتی باہنی کی تنظیم کو کالی آندھی کی علامت کے ذریعے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رات بند کمروں میں سونے والوں نے جاگنے پر سروں پر آسمان دیکھا کہ جس پر سیاہ گھنگور گھٹائیں برس پڑنے کو تلی کھڑی تھیں۔ لوگوں کی حیرت بجا تھی کہ راتوں رات یہ کیا ہوا کہ مکانوں کی چھتیں ہی غائب ہو گئیں اور وہ بھی اس صفائی سے کہ شہر کی باقی ہر شے سلامت تھی۔''(۲۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اور یوں اگلے روز بہت دن چڑھے لوگ جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ آج مکانوں کے

دروازے کھڑکیاں اور روشندان بھی حیرت انگیز طور پر غائب ہو چکے تھے جس سے گھروں کے منظر گلیوں اور سڑکوں سے گزرنے والوں نے صاف دیکھے۔"(۲۵)

احمد جاوید لکھتے ہیں:

"ادھر اس شخص نے پلکیں کھولیں اور ستارہ سحر کو آسمان پر دیکھا اور رات کا اندازہ کیا اور پھر جب اپنے جسم پر نگاہ ڈالی تو حیران ہوا مگر جب لوگوں کو دیکھا تو ذرا حیرت نہ ہوئی کہ اب وہاں کچھ نہ تھا سوائے ان آنکھوں کہ کہ جو دیکھ سکتی تھیں مگر کیسے دیکھتیں؟ حتیٰ کہ برگد تلے بھی کچھ نہ تھا۔ مگر آنکھیں کہ جواب بھی کھلی تھیں کائنات کی طرف سے مگر بند تھیں شہر کی طرف سے......"(۲۶)

احمد جاوید کے اس افسانے میں مختلف علامتوں کا استعمال ملتا ہے۔ اس افسانے میں کالی آندھی مکتی باہنی تنظیم کی علامت ہے جس میں ہندوستانی فوج نے شامل ہو کر ظلم و بربریت کی تاریخ رقم کی۔ درویش جماعت اسلامی کی البدر تنظیم کی علامت ہے جس نے سب جانتے ہوئے بھی دانشوروں کو گھروں سے اُٹھایا اور قتل کیا۔ گم ہونے والا شہر مشرقی پاکستان کی علامت ہے۔ پاگل آدمی ایوب خان کی علامت ہے جس نے بھارت کے خلاف ۱۹۶۵ء کی جنگ جیتی اور گم ہو جانے والے شہر کے لوگ پاکستانی سیاست دان اور وہ آمر ہیں جن کی آپسی نادانیوں کی وجہ سے یہ حادثہ رونما ہوا۔ احمد جاوید کے مطابق مشرقی پاکستان اس لیے گمشدہ ہو گیا کہ کسی نے بھی اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ سب دوسروں کو دیکھتے رہے اور پاکستان کا وجود دولخت ہو گیا۔ اس موضوع پر قابل اجمیری نے کیا خوب کہا ہے:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا(۲۷)

ان افسانوں کے علاوہ احمد جاوید کے وہ افسانے جو مزاحمت کا علامتی اظہار ہیں اُن میں اور پھر خودکشی، بہر بہوٹی، قصہ غم کی ہیروین، کولہو کے بیل، چوہے اور بھیڑیے، سانپ، جنگلجا نور آدمی، مصاحبین خاص، گدھ، اور پیادے شامل ہیں۔ احمد جاوید کا شمار اُن افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے جن کو فن افسانہ نگاری پر مکمل عبور ہے۔ اُن کے افسانے خارجی واردات پر مبنی ہوں یا داخلی واردات پر وہ کہانی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ احمد جاوید کی علامتیں سادہ، آسان فہم اور اپنے اندر بھرپور ابلاغ لیے ہوئے ہیں۔ اُن کے تمام افسانوں میں جتنی بھی علامتیں استعمال ہوئیں ہیں ساری کی ساری قابل فہم اور عام قاری کی رسائی میں ہیں۔ اُن کی کہانی کی بنت قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے اور لمحہ بھر کے لیے بھی قاری کو اُکتانے نہیں دیتی۔

احمد جاوید نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا اُسے آمریت کا جوبن کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے اُنہوں نے اپنے افسانوں کو علامت کا لباس پہنا کر عام قاری تک پہنچایا۔ احمد جاوید کا انوکھا اسلوب، کہانی کی بنت، عام آدمی کی زبان اور عام فہم علامتیں اُنہیں ایک بڑا علامتی افسانہ نگار بناتی ہیں۔ اُن کے لکھے ہوئے افسانے اپنے اچھوتے خیالات اور عمدہ علامت نگاری کی بدولت اُنہیں افسانہ نگاری اور علامتی مزاحمتی ادب میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

حوالہ جات

۱،۲۔ احمد جاوید،گمشدہ شہر،مجموعہ،(اسلام آباد: پورب اکادمی،جنوری۲۰۱۴ء)،ص۳۸۳

۳۔ احمد جاوید،غیر علامتی کہانی،مجموعہ،(اسلام آباد، پورب اکادمی،جنوری۲۰۱۴ء)،ص۲۵۲

۴۔ ایضاً،ص۲۵۴

۵۔ احمد جاوید،گمشدہ شہر،مجموعہ،(اسلام آباد: پورب اکادمی،جنوری۲۰۱۴ء)،ص۳۵۱

۶۔ احمد جاوید،غیر علامتی کہانی،مجموعہ،(اسلام آباد: پورب اکادمی،جنوری۲۰۱۴ء)،ص۲۳۹

۷۔ ایضاً،ص۲۴۰

۸۔ ایضاً،ص۲۴۴

۹۔ ایضاً،ص۲۸۸

۱۰۔ ایضاً،ص۲۹۰

۱۱۔ ایضاً،ص۲۹۲

۱۲۔ احمد جاوید،گمشدہ شہر،ص۳۶۶

۱۳۔ احمد جاوید،غیر علامتی کہانی،ص۲۶۷

۱۴۔ ایضاً،ص۲۶۶

۱۵۔ ایضاً،ص۳۸۸

۱۶۔ ایضاً،ص۳۸۹

۱۷۔ احمد جاوید،ابتدائیہ:چڑیا گھر، مجموعہ،((اسلام آباد: پورب اکادمی،جنوری۲۰۱۴ء)،ص۱۳۵

۱۸۔ احمد جاوید،غیر علامتی کہانی،ص۴۱۴

۱۹۔ وزیر آغا،علامت کیا ہے،مشمولہ:علامت نگاری،(لاہور: بیت الحکمت،۲۰۰۵ء)،ص۱۴۷

۲۰۔ ایضاً،ص۲۵۸

۲۱۔ احمد جاوید،ابتدائیہ:چڑیا گھر،ص۱۵۷

۲۲۔ ایضاً،ص۱۳۵

23. *https//dailytaqat.com/articles/the-fall-of-dhaka/*

۲۴۔ احمد جاوید،گمشدہ شہر،ص۳۶۸

۲۵۔ ایضاً،ص۳۶۹

۲۶۔ ایضاً،ص۳۷۱

27. *https://www.rekhta.org/couplets/vaqt-kartaa-hai-parvarish-barson-qabil-ajmeri-couplets-3?lang=ur*